اور ننھے زردی مائل سفید پھولوں کے گرنے کی رفتار پھر اتنی سست پڑ گئی کہ جانو فضا میں رینگتے ہوئے نیچے آ رہے ہیں۔

تائی اماں کو حرکت ہوئی "توبہ توبہ بڑی گرمی ہے۔ ہوا بالکل رک گئی۔" اور انھوں نے زور زور سے پنکھا کرنا شروع کر دیا۔

بڑی آپا چونکیں۔ انہیں یاد آیا کہ باوا کو نہانا ہے "تحیینہ، اری تحیینہ۔ بی بی ذرا غسل خانے میں تولیہ صابون رکھ دے اور دیکھ کہ کسلے میں پانی ہے؟"

بڑی آپا کو باتیں کرتے کرتے کسی بھی بات پر ابا میاں یاد آ جاتے، ان کی بات کا خیال آ جاتا، آنکھ بھر آتی۔ شروع میں یہ لمحے جلدی جلدی آتے، پھر وقفے لمبے ہونے لگے، لمحے دیر سے آتے اور جلدی رخصت ہو جاتے۔ سوگ کی فضا حویلی سے رخصت ہو چلی تھی اور روز مرہ کے ذکر اذکار شروع تھے۔ ابا میاں کی یاد کم ہونے لگی اور بڑی آپا کی توجہ کا مرکز باوا بننے لگے۔ پھر امی تھیں کہ بہت دنوں کے بعد ملی تھیں اور سینکڑوں ذکر ان سے کرنے کے تھے، ضروری بھی اور غیر ضروری بھی۔ پھر وہ اسے دیکھتیں اور انہیں خیال آتا کہ شادی اس کی کب ہوگی۔

" ماشاءاللہ جوان ہو گیا ہے اور اب تعلیم سے بھی فراغت ہو گئی۔ سمجھو، بہو تم اس کا بیاہ کر دو اب۔"

امی جواب دیتیں "بڑی آپا تمہارے بھائی کہتے ہیں کہ ہم لونڈے کی منشا کے بغیر شادی نہیں کریں گے نئی روشنی کے لونڈے ہیں، ماں باپوں کی پسند سے ان کی پسند نہیں ملتی۔ ان کا کہنا تو یہ ہے کہ بھئی خود پسند کر لیں، ہم شادی کر دیں گے۔"

" کیوں ضمیر بیٹا، تمہیں کیسی دلہن پسند ہے؟" بڑی آپا کا رخ اس کی طرف ہو جاتا۔

تائی اماں بول اٹھتیں "اجی تمہیں نہ بتا دے گا وہ مجھے بتا دے گا۔ بیٹا میرے کان میں بتا دے، جیسی دلہن کہوے گا ویسی ہی ڈھونڈ کے لا دوں گی۔"

" ہاں آں دلہنیں تو پھر اکلگڑی ہیں ناکہ پینٹھ میں گئے اور خرید لائے،" بڑی آپا کی آواز

بس گرمی پیدا ہو جاتی ہو تائی اماں ، اچھی دُلہن گرمی پڑی نہیں ملتی ہے،،

موضوع اس آہستگی سے بدلتا کہ اسے احساس تک نہ ہوتا۔ اس کی شادی سے ہٹ کر لڑکوں لڑکیوں کی عمومی حالت پر باتیں ہونے لگتیں اور بات کہیں سے کہیں پہنچتی وہ پھر الف لیلہ پڑھنے میں لگ جاتا۔ اس نے اپنے بیٹھنے کے لئے ایسی جگہ منتخب کی تھی جہاں سب سے دیر میں دھوپ پہنچتی تھی۔ کیاری سے ہٹ کر ، جہاں پودینے کے علاوہ بیلے کے بھی کئی پودے کھڑے تھے ، نیم کا گھنا پیڑ تھا ، جس کے نیچے دیوار کے سہارے بلی گھڑونچی بنی تھی کہ خود ہری بھری اک کیاری تھی ، کورے کورے گھڑے کچی ٹھلیاں ، کالی اک صراحی جس کی پتلی لمبوتری گردن میں اکثر بیلے کے پھولوں کا گجرا پڑا ہوتا ، چمکتا دمکتا مراد آبادی گلاس اور نیم کے زردی مائل سفید پھول کہ گھڑوں کی بھیگی طشتریوں پہ ، گلاس میں ، گھڑونچی پہ ایک طرف رکھی ہوئی پانوں کی تر بتر تھالی میں ، اور گھڑونچی کی کچی زمین پہ بکھرے ہوتے۔ سرکنڈوں کی تیلیوں والا مونڈھا اس نے کیاری اور گھڑونچی کے بیچ میں دیوار کے سہارے ڈالا تھا اور اسے اپنی مستقل بیٹھک قرار دیا تھا۔ پاس ہی چھپر کھٹ پہ بڑی آپا ، امی اور تائی اماں بیٹھی رہتیں ، باتیں ہوتی رہتیں ، پاندان کھنکتا رہتا اور سروطہ چلتا رہتا ، کبھی کبھی باوا کا بیٹھک میں بیٹھے ہوئے دم گھٹنے لگتا اور ایک چارپائی نیم کے نیچے پڑ جاتی۔ چاروں طرف پیلے پیلے اور زردی مائل سفید بوسیدہ کاغذ پھیلے ، بیچ میں باوا جو عینک لگائے ہر کاغذ کے ایک ایک لفظ کو احتیاط سے پڑھتے اور پرانے دھرانے ایک بستے میں تہ کر کے رکھتے جاتے۔ اس عرق ریزی کے باوصف ایسا رقعہ کوئی اب تک ہاتھ نہیں آیا تھا کہ گروی پڑی حویلی کا مقدمہ جیتنے کی صورت پیدا ہوتی۔ لمبا چھریری سا قد ، رنگ گندمی ، بال کھچڑی خاندان میں پہلے شخص تھے کہ پتلون پہنا اور سرکاری نوکری کی۔ تائی اماں کو ان کی روش پر ہمیشہ اعتراض رہا ، کہا کرتی تھیں "اجی تحصیل داری سے پہلے بھی طور یہی تھا۔ برجس ڈالے فل بوٹ چڑھائے کھٹ کھٹ کرتا شکار سے واپس آیا : بندوق کونے میں رکھ ، تھیلہ گلے

سے اتار، فل بوٹ ایک طرف پھینک، چوکی پہ کھڑا ہو نماز پڑھنے لگا۔ میں ہا ہا کرتی کہ شبو میاں برجس اتار دو، وضو کر لو، شبو میاں کہاں سے سنتے ہیں "تائی اماں ولایت میں بھی لوگ نماز پڑھتے ہیں۔ وہاں پاجامہ کوئی نہیں پہنتا"، خاک بھوبھل موئے ولایت والوں پہ برجسوں اور پتلونوں میں لوگ نماز پڑھنے لگیں تو قیامت نہ آجاوے اور بی بی تحصیلداری کے بعد تو جنٹلمینی میں جو کسر رہ گئی تھی وہ بھی پوری ہو گئی۔ ابا میاں مجھ ڈوبی کو طعنے دیوے تھے "تائی اماں تمہارے بشیر حسین تو بالکل انگریز ہو گئے ہیں۔ تم نے پالا تھا تم ہی جانو"۔ اے میاں میں کیا جانوں، میں نے پالا تھا یہ تھوڑا ہی کہا تھا کہ بیٹا انگریز بن جا"، مگر عمر کے ساتھ ساتھ اب انگریزیت بھی بہت کم ہو گئی تھی۔ رہی تحصیلداری سو آئے تو تھے چھٹی لے کر لیکن ابا میاں کے گزرنے کے بعد اتنی ذمہ داریاں آپڑی تھیں کہ یہی سوچا کہ پنشن میں اب کون سی مدت باقی ہے، یہ مدت رخصت پہ کاٹو، آخر رخصت بھی تو برسوں سے نہیں لی تھی اور نوکری چاکری سے فارغ ہو کر گھر پہ بیٹھو۔ حویلی کا مقدمہ ایک طرف، پھر زمینوں کی دیکھ بھال کھیتی باڑی کا انتظام، پھر اس کوٹھی کی منصوبہ بندی، جس کی تعمیر کا خیال پنشن لے کر گھر بیٹھنے کے خیال کے ساتھ ساتھ پیدا ہوا۔ روز منہ اندھیرے اٹھنا، بھونڈ پہ جا کر کھیتوں کو دیکھنا، کوٹھی کی جگہ کا جائزہ لینا، واپسی پر انہیں پیلے بوسیدہ کاغذوں پہ جھک جانا۔ کاغذ پڑھتے پڑھتے تھک جاتے اور دم لینے کو عینک اتار کے کاغذوں پہ رکھتے، کم گوئی کے باوجود کبھی کبھی کوئی فقرہ منہ سے نکل ہی جاتا۔ بڑی آپا کی توجہ فوراً باتوں سے ہٹتی، بھائی کے فکرمند چہرے کو تکنے لگتیں "یہ تو بڑا غضب ہو گا۔"

باوا ناخوش سے لہجے میں کہتے "ابا میاں بھی تو غضب کر گئے ہیں۔ اتنا سود بٹانے کے لئے رقم کہاں سے آئے۔"

بڑی آپا کی آنکھیں بھیگنے لگتیں، آواز میں رقت پیدا ہو جاتی "باغ تو پہلے ہی بیگ چڑھ گیا تھا، بزرگوں کی بچی کھچی یادگار بھی....." بڑی آپا چپ ہو جاتیں، پھر کہنے لگتیں "اماں جی

یہیں سے سدھاریں، ابامیاں نے اسی گھر میں آنکھ کھولی اسی گھر میں آنکھ بند کی۔ بڑے ابا نے بھی آخری سانس یہیں لیا۔ بڑی آپا کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے اور باوا پھر کاغذوں کو پھیلے دلی سے اور پھر انہماک سے الٹنے پلٹنے لگتے۔

اس کی آنکھوں میں پوری حویلی کہ مانند ایک بر اعظم کے بھی گھومنے لگتی، لداؤٹ کی چھتوں والے اونچے کشادہ کمرے، کٹواں دروں والے لمبے لمبے دالان، مٹی میں اٹی اندھیری بخاری جس کے اندر جھانکتے ہوئے اسے ہمیشہ ڈر لگا کہ کہیں بخاری کی باسی بیجا اندر نہ کھینچ لے، نہ خانہ جس کے اور چھور کا اسے کبھی اندازہ نہ ہو سکا کہ اس کے تین جنگلے دالان کے نیچے آنگن میں نکلے ہوئے تھے مگر ایک جنگلا دالان کے اندر کے بغلی کمرے میں بھی نکلتا تھا اور ایک جنگلا بڑے کمرے کے اندر والے چھوٹے اندھیرے کمرے میں کھلتا تھا اور لمبی چوڑی ران جہاں چھتیں کہ زینے میں داخل ہوتے، ہی احساس ہوتا کہ کسی اجنبی ملک میں داخل ہوئے ہیں اور کسی کسی کچی چھت پہ اُگی ہوئی گھاس کہ برسات نکل جانے پر سوکھی مرنڈ ہو جاتی اور کسی قدیمی زمانے کی یادگار نظر آتی، اپڑی جیسے سوکھے پت تالے کہ سوکھ جانے والے دریا سے لگتے اور پھر وہ پُر اسرار سرحد، سفید بیٹوں سے لسی ہوئی کالی پڑتی منڈیر، جس کے پرے اونچی نیچی کچی پکی ان گنت چھتیں پھیلی نظر آتیں اور آگے ان سے وہ سرخ پتھروں والا اونچا مندر، بر اعظموں سے پرے ایک اور بر اعظم، جہاں اونچا ہمالیہ سر اٹھائے دکھائی دیتا، لال مندر چھوڑ کر کہ حویلی تو کیا ہمالیہ سے بھی اونچا دکھائی پڑتا۔ حویلی کی چھت بستی میں سب سے اونچی تھی حویلی کی وسعت اور اونچائی کا پورا احساس اس وقت ہوتا تھا جب تائی اماں غدر کے دنوں کا ذکر سناتی تھیں۔ بی بی میں تو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئی تھی۔ بڑی اماں سنایا کریں تھیں۔ ایسی لٹس پڑی اور آپا دھاپی پڑی کہ ایک کو ایک کی خبر نہیں بھری بستیں ایسی اجڑیں کہ نہ کوئی نام لینے والا رہا نہ پانی دینے والا کوسوں چراغ جلے تھا نہ دھواں اٹھے تھا۔ جاٹ۔ گو جر رانگڑ طھ پورئیے۔ دھولئے بھالے بلم نچاتے دندناتے پھرتے آج یہ گاؤں

لوٹا، کل اس بستی پہ ہلا بولا پرسوں فلاں شہر پہ جا پڑے۔ کوئی شہر کوئی گاؤں نہ بچا کہ جہاں غدر نہ مچا ہو۔ بس ہماری بستی بچی تھی۔ سب نے مل کے کیا کیا کہ اپنی اپنی عورتوں کو حویلی میں بھیج دیا اور خود لٹھ تان تان کے بستی کے گرد پہرہ دینے لگے۔ حویلی کی چھت پہ سمجھ لو کہ سب سے اونچی تھی دور تک کا آدمی واں سے نظر آوے تھا۔ تین آدمی نقارہ سے لے کے چھت پہ بیٹھ گئے دن رات جاگیں تھے۔ مٹے گوجروں نے تین دفعے ہلہ بولنے کی ٹھانی۔ تینوں مرتبہ نقارہ بج بج گیا اور وہ تینوں دفعے باہر سے ہی لوٹ لوٹ گئے۔"

حویلی کی بلندی بھی قائم تھی اور وسعت بھی۔ مگر وہ پرانی کتنی ہو گئی تھی۔ ممٹیاں اور برجیاں کچھ تو ایسی ٹوٹی تھیں کہ بس آثار باقی تھے۔ جو باقی تھیں ٹوٹ پھوٹ رہی تھیں۔ منڈیریں کالی پڑ چکی تھیں اور دیواروں سے بوسیدہ پلستر کے پرت کے پرت گرتے تھے اور اتنے گر چکے تھے کہ ککڑ یا اینٹوں سے بنی دیواریں ننگی ہوتی جا رہی تھیں اور ککڑ یا اینٹوں کی درزوں سے پیلی پیلی مٹی ہر وقت گرتی رہتی تھی۔ دالان میں کمروں میں فرش پہ دیواروں کے سہارے جا بجا پیلی پیلی مٹی کی ننھی ننھی ڈھیریاں بن جاتیں اور پھر ان میں سے کبھی اللہ میاں کی بھینس نمودار ہوتی کبھی تیلیا راجہ اسے خوب کریدتا اور اپنے لئے سوراخ پیدا کر لیتا۔ پرانی جو چیز نظر نہیں آتی تھی وہ آنگن تھا لمبا چوڑا کچا آنگن کہ تیسرے پہر کو سقہ جب پہلی مشک بہاتا تو بس تھوڑی دیر کے لئے زمین گیلی نظر آتی اور بھاپ اٹھتی دکھائی دیتی اور اس کے بعد پھر زمین پیاسی کی پیاسی۔ اگلی مشکیں چھڑکا ڈھونے کے بعد زمین بھیگتی اور خوشبو دیتی اور پھر باوا کا تازہ حقہ مونڈھے کے آگے رکھا بہار دیتا اور وہ نیم جسے وہ بچپن سے دیکھتا آ رہا تھا۔ اور جانے کب سے کھڑا تھا مگر اسی طرح ہرا بھرا اور گھنا تھا کہ اس کے تلے ہمیشہ چھاؤں رہتی پھر وہ گھڑونچی کہ مانند ہری بھری کیاری کے تھی اور وہ کیاری کہ مثل گھڑونچی کے پانی میں تربتر رہتی اور خوشبو سے مہکتی رہتی۔ گوری لمبی انگلیوں میں جھمکتے مراد آبادی گلاس اور اس میں کچی ٹھلیا سے کبھی کوری صراحی سے گرتے چھنکتے میٹھے پانی کا رسیلا شور، تحسینہ اس کی

طرف توجہ کئے بغیر پانی پی گلاس گھڑے کے پیچھے رکھ پھر باورچی خانے کی طرف چلی جاتی اور وہ پھر الف لیلہ پہ، جو اس نے ابا میاں کی کتابوں سے نکال کر وقت گزاری کی نیت سے پڑھنی شروع کر رکھی تھی، جھک پڑتا۔ الف لیلہ پڑھتے پڑھتے کھو جاتا اور بھٹکتے ہوئے شہزادوں کے ساتھ خوب صورت سنگ دل ساحراؤں کی محل سراؤں میں داخل ہو جاتا۔۔۔ "ہوا بند ہو گئی" بڑی آپا کی آواز کے ساتھ وہ ایک ساتھ الف لیلہ کی محل سرا سے باہر آجاتا اور اس وقت اسے پتہ چلتا کہ بدن اس کا پسینے میں بھیگتا جا رہا ہے۔ سبز و سرخ لہریوں والا پنکھا بڑی آپا کے ہاتھ میں گردش کرنے لگتا "کمبخت ابھی سے اتنی مکھی ہے، برسات میں تو جنیں کیا حال ہوگا"

تائی اماں ٹوکتیں "بی بی برسات کہیں ہو تو سہی۔ اسار گزر چلا اور پانی کی بوند نہیں پڑی۔ توبہ اب کے تو بہت گرمی ہے۔ میرا تو مروڑیوں سے پنڈا بسر گیا۔"

پھر نیم کی ٹہنیوں میں ایک ہلکی سی لرزش تیرتی چلی جاتی اور امی کہتیں "اللہ تیرا شکر" نیم کی گھنی ٹہنیوں کے کسی گوشے سے اچانک فاختہ بولنا شروع کر دیتی اور ساتھ اس کے بنی آواز میں آواز ملانے لگتی "کولوں گی۔۔۔۔ پیسوں گی۔۔۔۔ آیا تھا۔۔۔ گیا تھا۔۔۔۔۔ کولوں گی، پیسوں گی، آیا تھا، گیا تھا۔۔۔۔۔" فاختہ بولتے بولتے چپ ہو جاتی اور پروں کی رسیلی سرسراہٹ کے ساتھ ٹہنی سے بلند ہوتی، ایک چرخ کھاتی اور پھر کوٹھے سے پرے نکل جاتی۔

تحسینہ باورچی خانے سے نکل کیاری پہ آبیٹھتی اور پودینے کی ننھی منھی پتیوں کو چنتے چنتے مونڈھے کے بالکل قریب آجاتی کہ وہ گوری گردن پہ پسینے کے شفاف قطرے دیکھ سکتا چٹیا کے نیچے سے نکلے ہوئے مہین بال بھیگی گوری گردن پہ چپکنے لگتے اور سفید وائل کی باریک قمیص کہیں کہیں سے بھیگ کر سڈول بھری ہوئی پشت میں پیوست ہوتی نظر آتی۔ گردن اور پشت سے نظر ہٹتا کہ وہ پھر الف لیلہ پہ نظریں گاڑ دیتا لیکن چند ہی لمحوں میں عزم اس کا ٹوٹنے لگتا اور نظریں اس کی پھر چوری چھپے چمکتی اور بندھی چٹیا پہ گوری گردن پہ بھری بھری

پشت پہ، پودینے کی مہکتی ہری گیلی پتیوں میں رینگتی ہوئی اور بھیگتی ہوئی گوری پتلی انگلیوں پہ بھٹکنے لگتیں۔

امی کی ہمدردی کی رگ اک روز پھڑکی تو بول پڑیں "بڑی آپا تحسینہ غریب تو کام کرتے کرتے ہلکان ہوئی جاوے ہے۔ اتنے بڑے بٹر کا سارا کام ایک جان پہ پڑ گیا ہے یہ بھی کوئی بات ہوئی"

بڑی آپا بولیں "ہلکان ہونے کی کیا بات ہے اس میں۔ گھر کا کام ہے باہر والے تھوڑا ہی آکے کریں گے۔"

"بڑی آپا"، امی بولیں "تم نے تو یہ ستم کیا ہے کہ سارا کام اسی پہ ڈال دیا ہے"

"اجی کنواری لونڈیوں کو کام کی عادت ہونی چاہیئے۔ آخر پرائے گھر جانا ہے، واں انہیں چھپر کھٹ پہ بٹھا کے کون کھلاوے گا۔"

"اے لو بڑی آپا تم الٹی بات کہو ہو۔ کنوار پنے کے دن ہی تو ہووے ہیں کہ ہنس بول لو، اس کے بعد کہاں یہ مہلت۔ نا بی بی یہ بھی کوئی بات ہوئی، میں بیٹھی بیٹھی کب تک بان توڑوں۔۔۔۔۔"

"نا بھو میں تمہیں چولہے پہ نہ بیٹھنے دوں گی۔" بڑی آپا نے فوراً احتجاج کیا۔

امی نے عزم باندھا اور توڑ دیا۔ کام پھر تحسینہ ہی کو کرنا پڑتا۔ گھر کا نظام اسی پرانے ڈھرے پہ جاری رہا۔ تحسینہ کی کفایت شعاری کے احساس نے یہ فرق ڈالا کہ امی کا پیسہ کوڑی بھی اس کے پاس جمع رہنے لگا۔ اسے روز اس کے سامنے ہاتھ پھیلانا پڑتا۔ "کتنے؟" وہ سوال کرتی۔ جتنے مانگتا اتنے دے دیتی، مگر اس تکلف کے ساتھ گویا پیسے ضائع کرنے کے لئے دیئے جا رہے ہیں۔ اچھے اور بنی ٹھن نازل ہوتے اور اس سے ایک ایک آنہ وصول کر لیتے اور پھر گھر بھر میں اس کا اعلان کرتے۔ بنی کو بڑی آپا جھڑکتیں، پھر اس پہ بگڑتیں "بیٹا اسے کیوں پیسے دیے جاتے ہیں۔ چٹوری ابھی بازار جاوے گی اور پھینک

آئے گی۔" اچھے کو پیسے ملنے پر تائی اماں اسے بھر بھر گود دعائیں دیتیں "باپ کے طریوں افسر بنے، حکومت کرے، سہرا جلدی بندھے، چاند سی دلہن گھر میں آوے، ماں باپ بہاریں دیکھیں"۔ تائی اماں کے بال سفید ہو گئے تھے، لیکن کاٹھی ابھی تک بنی ہوئی تھی کہ پائجامہ پھنس کے ٹانگوں میں آتا تھا اور چہرے کی جھریوں کے باوجود پتہ چلتا تھا کہ کسی زمانے میں حسین ہوں گی۔ ایک بڑی آپا تھیں کہ جسم کی عمارت ہل گئی تھی اور دوہرا بدن دوہرا ہوتے ہوتے بھی اکہرا ہو گیا تھا کہ جو کپڑا پہنتیں خلتے سے نکلتے۔ تائی اماں کس رشتے سے تائی اماں تھیں اسے اب تک پتہ نہیں تھا۔ ایک دو کی نہیں گھر بھر میں سب ہی کی تائی اماں تھیں، یہاں تک کہ ابا میاں بھی انہیں تائی اماں ہی کہا کرتے تھے۔ ان کی بیٹی کے متعلق اسے بس دھندلا دھندلا خیال تھا کہ ایک گوری چٹی بڑی بڑی آنکھوں والی لمبے قد کی عورت تھی۔ اس کی رخصت کے بعد بڑی آپا نے کہا تھا "تائی اماں کی لونڈیا تو ڈوب گئی۔ یہ تو بالکل گنوار لوگ ہیں"، اور امی نے جواب دیا تھا "اجی اب عرش کا تارا تھوڑا ہی اترتا۔ اچھا ہے غریب لوگ ہیں لونڈیا کو اچھی طرح رکھیں گے"، پھر کب اور کیسے، یہ اسے یاد نہیں تھا۔ بس اتنا یاد تھا کہ مرنے کی اس کی خبر آئی تھی جب تائی اماں اس کے چالیسویں کے بعد واپس آئیں تو ایک گورا چٹا بچہ ہر وقت ان کی گود میں ہوتا اور اچھے کے نام سے اسے کھلاتیں اور پلاتیں۔

اچھے اور بنی پیسے ملتے ہی تیر کی صورت باہر جاتے اور تھوڑی دیر میں وہ دیکھتا کہ سینکوں میں لگے ہوئے برف کے گولے، جن میں زرد، سرخ، سبز رنگ تیرتے ہیں، لئے چلے آ رہے ہیں اور زبان لگا لگا کے انہیں چاٹتے ہیں۔

مونڈھے پہ بیٹھے بیٹھے وہ تھک جاتا۔ الف لیلہ بند کر جمائیاں لیتا، پھر اس کی آنکھیں بند ہونے لگتیں، اتنے میں بڑے کمرے سے بڑی آپا کی آواز آتی "ارے بھئی مضمیر کہاں ہیں ابھی تک باہر بیٹھے ہیں۔ تحسینہ بھیے کو بلا کر کھانا کھالو"۔ تحسینہ باہر آتی، روکھے پھیکے انداز

میں کہتی "کھانا کھا لو چل کے" اور وہ اُٹھ کھڑا ہوتا۔ کبھی کبھی وہ اتنا بیزار ہو جاتا کہ کھانے کو اس کا مطلق جی نہ چاہتا۔ اسے اپنے آپ پہ غصہ آتا۔ تحسینہ پہ غصہ آتا، بند ہو جانے والی ہوا پہ، بھنبھناتی ہوئی مکھیوں پہ، چھٹیوں کے طویل ہوتے دنوں پہ۔ تحسینہ پھر آکر اسی روکھے پھیکے انداز میں کہتی "کھانا کھا لو چل کے۔" اور وہ الف لیلہ بند کر پھر چپکے سے اس کے پیچھے ہو لیتا۔

(۳)

"بجلی بجلی میرا بیاہ کدھر؟" امیا کی گٹھلی کی گری منی کی نرم انگلیوں سے پھسل کر چارپائی سے نیچے جا پڑی۔

چارپائی پہ ایک طرف ہرے چھلکوں اور کٹی ہوئی سفید بجلیوں کی ایک ڈھیری لگی تھی۔ اور پاس ہی سفید تشلے میں سفید چھلی ہوئی امیاں بھری رکھی تھیں۔ تحسینہ سفید چھلی ہوئی ثابت امیا اٹھاتی، چاقو سے دو کرتی اور پھر چاقو کی نوک سے بجلی کے ٹکڑوں کو نکال امیا کی قاشوں کو تشلے میں ڈال دیتی۔

منی نے اپنی چمکتی ہوئی ثابت بجلی اٹھائی اور ضمیر کے مونڈھے کے پاس آکھڑی ہوئی "ضمیر بھائی بتاؤ میرا بیاہ کدھر ہوگا؟"

"خود بوجھ لو" وہ اس وقت الف لیلہ پڑھنے میں ایسا مصروف تھا کہ نظریں اٹھانا بھی ناگوار ہو رہا تھا۔

منی نے بجلی سے اپنا بیاہ پوچھا، پھر اچھے کا بیاہ پوچھا، پھر ضمیر بھائی کا۔ "ضمیر بھائی تمہارا بیاہ پچھم میں ہوگا۔"

"اچھا" اس نے بے اعتنائی سے جواب دیا اور پھر کتاب پڑھنے لگا۔

"بجلی بجلی باجی کا بیاہ کدھر؟"

بجلی ٹپ سے اس کی کھلی کتاب میں آ کے گری۔

بنی نے تالی بجا کے شور مچایا "آہا ہا باجی کا بیاہ ضمیر بھائی سے ہوگا۔"

دل اس کا دھک سے رہ گیا: خون خشک، اور ہاتھ پیر جانو جمے کے جمے رہ گئے بس یہ خواہش کہ کسی طرح آنکھوں سے اوجھل ہو جائے، باہر چلا جائے۔ پر جسم ساکت تھا اور نظریں کتاب پہ اسی طرح جمی ہوئیں اور دل دھڑ دھڑ کرتا تھا۔ ہوا پھر بند ہو گئی تھی اور ٹہنیاں نیم کی پھر سر نیوڑہائے خاموش تھیں، پسینے کے قطرے اس کی گردن پہ اور اس کے ماتھے پہ ابھر آئے تھے۔ گردن پہ سرسراتے قطرے کالر کے اندر رسنے لگے۔ پھر ایک پتلی گیلی لکیر قمیض کے اندر بیٹھ پہ سرکتی ہوئی رینگنے لگی۔ دل میں آئی کہ کتاب بند کر دو اور آنکھ بچا کر آہستہ سے باہر نکل جاؤ مگر جسم تھا کہ اسی طرح اپنی جگہ پہ جما تھا تحسینہ کی طرف دیکھنے کی تو اسے ہمت نہیں ہوئی تھی لیکن چاقو کے امیوں میں درد رلنے اور بجلیوں کے سینوں میں اترنے کی مدھم آواز اسی رفتار سے بغیر کسی فرق کے آئے جا رہی تھی۔ ہوا بند تھی اور ٹہنیاں نیم کی سر نیوڑہائے خاموش پھر فاخرہ نے نیم کی کسی خاموش ٹہنی پہ بیٹھے بیٹھے بولنا شروع کر دیا۔ بجلی سے۔ بنی کی توجہ بھٹکی اور وہ آواز میں آواز ملانے لگی "کوٹوں گی..... پیسوں گی..... آیا تھا.... گیا تھا.... کوٹوں گی....."

"صبح کا سبق یاد کر لیا ہے؟" تحسینہ بولی اور بنی کو جانو بریک لگ گیا۔

"س.....ب.....ق۔"

"ہاں سبق" تحسینہ نے اسی اطمینان سے درشت لہجے میں کہا اور چاقو الگ رکھ تشلا سنبھال چارپائی سے اٹھنے لگی۔

بنی خاموش۔

"نکالو سیپارہ اور پڑھنے بیٹھو۔" اس نے کڑی نظروں سے اسے دیکھا۔

بنی کا دم خشک، تیزی طراری ساری ختم، سمجھو کوئی قیدی ہو، اس نے بڑی بے چارگی

سے آہستہ آہستہ جزدان کھولا۔ وہ انگلیاں، وہ ہاتھ جن میں ابھی بجلی سے بیاہ پوچھتے ہوئے بجلی دوڑتی تھی، اب مجبور تھے اور حکم کے پابند۔ اس نے مرے ہوئے دل سے سیپارہ نکالا اور ورق الٹ پلٹ کر کے سبق ڈھونڈنے لگی۔

تحسینہ نے امیوں کا تشلا اٹھایا، نیم کے نیچے سے اُٹھ کر دھوپ میں پڑی ہوئی چارپائی کے پاس گئی، تشلا اُلٹا اور امیوں کی قاشوں کو کھری چارپائی پہ پھیلانے لگی۔

ضمیر کتاب آہستہ سے بند کر، مونڈھے پہ رکھ، دبے پاؤں باہر ہولیا۔

گلی خاموش تھی، خاموشی میں گھلی ملی ایک بھنبھناہٹ، ایک گونج کہ کہیں دور شہد کا چھتا ٹوٹنے پر بہت سی مکھیاں بھنبھناتی ہوں۔ گلی میں چھاؤں پھیلی تھی، سوا ان دیواروں اور نالیوں کے جن کے مقابل کے مکان اونچے نہیں تھے۔ ایک کتا کہ جانے کب سے نالی کے گندے میلے پانی میں بیٹھا زبان نکالے ہانپ رہا تھا۔ قدموں کی آہٹ سے باہر نکلا، پورے جسم کو ایک جھٹکا دیا اور گیلے جسم سے بوندیں برساتا ایک طرف کو ہولیا۔ اپنی گلی سے مڑتے ہوئے کوڑے کے ایک ڈھیر پہ اونگھتی، موٹی مرغیوں نے چونک کر چونچیں اٹھائیں اور "کڑ" کی ایک دھیمی سی بے ساختہ آواز ہوئی۔ دم بھر کے لئے اسے گمان گزرا کہ بھول کر کسی اجنبی گھر میں کسی زنان خانے میں داخل ہو گیا ہے اور ایک دم سے بہت سی نظریں اس پہ اٹھ گئی ہیں وہ آہستہ سے آگے بڑھ گیا چند قدم چلا تھا کہ پیچھے کسی مرغے نے زور سے بازو پھٹ پھٹائے اور کڑکڑوں کی آواز بلند کی۔ سامنے دیوار کی سایہ دار منڈیر پہ ایک اونگھتا ہوا سفید براق مرغا چونکا، بھرپری لی، زور سے بازو پھٹ پھٹائے اور کڑکڑوں کوں کی بانگ بلند کی۔

گلی سے نکل کر وہ لال مندر کے چوک میں آگیا۔ لال پتھر جل رہے تھے، پگھل رہے تھے۔ کنوئیں کی سُرخ سنگین من تپ رہی تھی۔ لوہے کی چھوٹی بڑی چرخیاں کہ کنوئیں کے دھانے کے گرد نصب تھیں، خشک تھیں، خاموش تھیں۔

پیاؤ کی گلی سے نکلتے ہوئے اسے ٹھنڈک لگی، پر گھڑی بھر میں ٹھٹھیروں والی گلی آگئی

جہاں دھوپ اور دھواں تھا اور بے شکل دھاتوں اور پیتل اور تانبے کی بڑی بڑی تھالوں اور دیگچوں اور تیڑوں پہ پڑتی ہوئی چوٹوں سے یہ شور کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ شور کم ہوتا گیا، پیچھے گم ہوتے ہوتے رستے میں لپٹتا گیا۔ کنجڑوں والی گلی میں کالا بجار اک بیچ میں اڑا کھڑا تھا۔ کوشش پر بھی جب وہ ٹس سے مس نہ ہوا تو وہ دیوار سے لگ کو آہستہ آہستہ چلتا، لاتوں اور سینگوں کی مار سے بچتا، گلی سے باہر نکل گیا۔ گلی سے قصائیوں کے محلے میں، قصائیوں کے محلے سے پکی سڑک کو پھلانگتا ہوا دگڑے میں، دگڑے سے بھونڑ والے رستے پہ۔

اسے دیکھ کے گندل کھڑا ہو گیا "ابے ہیرا" اس نے ہیرا کو پکار کے بلایا "چھوٹے میاں جی آیو ہیں، کھاٹ ڈال دے۔"

ہیرا چارپائی لئے دوڑا دوڑا آیا، چارپائی بچھاتے ہوئے بولا "میاں جی جل پانی لاؤں۔"

"نہیں بھئی۔"

گندل چلم لے کے چارپائی کی پٹی سے لگ کر بیٹھ گیا۔ کنواں اس وقت نہیں چل رہا تھا۔ اور گندل اور ہیرا فارغ نظر آتے تھے۔ گندل نے چلم منہ سے لگائی اور آنکھیں اس کی مندنے لگیں۔ ہیرا اس کے آنے پہ کچھ زیادہ پرجوش نظر آتا تھا۔ آنکھوں میں اس کی چمک پیدا ہو گئی تھی اور ایک بے تابی کہ کچھ کہنا چاہتا ہوا اور کہہ نہ سکے۔

"چھوٹے میاں" آخر اس کی زبان کھل ہی گئی "چھوٹے میاں" یو کیوے ہیں کہ یاں پہ کوٹھی ہو گی۔ وا کے بعد تو سگرا بڑ حویلی سے یہیں پہ آجا یوے گا۔ جدوں ابا میاں تھے تو یاں پہ گھنی رونک رہوے تھی۔ کٹائی کے دنوں میں تو سگرے یہیں پہ رہوے تھے۔ پر وا کے بعد تو..."

ہیرا کی آواز دھیمی پڑ گئی "نام رام کا"

وہ چپ بیٹھا رہا۔ گندل بھی چپ تھا، آنکھیں بند تھیں اور چلم کے کش جاری تھے۔

ہیرا پھر بولا "تو چھوٹے میاں، تحصیل دار صاب اب تو ٹکیں گے؟"

"ہمبے" اس کی طرف سے گندل نے جواب دیا "پنشن لے ریو ہیں۔ وا کے بعد یئیں

ٹکیں گے۔"

"تو چھوٹے میاں، تم بھی پلٹ کے نیئں جا لیو؟"

"للہ کی تو پڑھائی پوری نیئں بھئی ابھی" گندل نے پھر اس کی طرف سے جواب دے دیا۔ پھر اس نے آنکھیں کھولیں، کھانسا اور چلم کو ہیرا کے ہاتھ پکڑاتا ہوا بولا "چھوٹے میاں اب تو کتنے برس بیت گیو، پو تمری پڑھائی کا کب انت ہوئے گا۔"

"بس تھوڑے سے ہی دن باقی رہ گئے ہیں" اس نے جواب دیا۔

مگر گندل اس کی بات نہیں سن رہا تھا۔ اس کی آنکھیں آس پاس کی چیزوں سے ہٹ کر سامنے کے کھیتوں میں پہنچ گئی تھیں جہاں ہریالی پہ دھوپ چھاؤں کا کھیل ہو تا تھا، جلدی جلدی چلتی ہوئی دھوپ اس کے پیچھے دوڑتا ہوا سایا: ابر کی ہلکی چادر کھیتوں میں پھیلتی چلی گئی اور دھوپ کھیتوں سے پرے پیڑوں کی قطار کو چھوتی ہوئی آگے پھلانگ گئی گندل اور ہیرا دونوں کی آنکھیں اوپر اٹھ گئیں اور خود اس کی بھی۔ اکا دکا تیرتے ہوئے سفید بادل آپس میں گھل مل کر سورج پہ چھا گئے تھے۔

"گندل" ہیرا آہستہ سے بولا۔ "پو ورشا کیا کہوے ہے۔ میری تو، گندل، کنواں چلاتے چلاتے کا پنج نکل گئی اور لوندیہ پڑی تو بیلوں کی بدھیا بیٹھ جاوے گی۔" اس نے چلم کو آہستہ سے گندل کی طرف بڑھا دیا۔

گندل نے خاموشی سے چلم کا گھونٹ بھرا، پھر سوچ بھرے لہجے میں بولا "ورشا اب کے دیر سے ہوگی۔ جوتشی جی کیبو تھے کہ یو سال سخت ہے۔" اس نے پھر چلم کا گھونٹ لیا اور ہیرا کی طرف چلم بڑھا دی "لالہ یو میں آپنح مندی ہوگئی۔ اپلا رکھ دے۔"

ہیرا چلم لے کر بھوبھل میں دبے اُپلے کے پاس جا بیٹھا۔ گندل کی آنکھیں پھر مندنے لگیں۔ آنکھیں مندنے لگیں اور ہونٹ ہوتے ہوتے ہلنے لگے۔

رات گنوائی سوئے کے دوس گنوا یو کھائے
ہیرا جنم امول تھو کوڑی بدلو جائے

گندل کی آنکھیں بند تھیں، جسم ساکت، سارے بدن کا جی آواز میں کھنچ آیا تھا کہ دھیرے دھیرے ابھر رہی تھی، پھیل رہی تھی۔

چارپائی سے اُٹھ وہ آہستہ سے واپس گھر کی طرف ہو لیا۔ کھیتوں سے پرے کے درختوں پر دھوپ پھر اتر آئی تھی۔ دھوپ پلٹ رہی تھی، درختوں سے کھیتوں میں اتر رہی تھی اور چھاؤں کی چھاؤنی اُٹھ رہی تھی۔

گھر میں اس نے قدم رکھا تو دن ڈھلنے لگا تھا اور دالان کے سامنے صحن میں دور تک چھاؤں کی چوڑی پٹی پھیل گئی تھی، لیکن بڑے کمرے کے دروازے ابھی نہیں کھلے تھے اور خس کی ٹٹی پانی سے اسی طرح شرابور تھی۔ صحن سے وہ دالان میں آیا اور بڑے کمرے کی طرف بڑھنے لگا کہ جاتے جاتے وہ جھجکا اور اس کا رُخ بڑے کمرے سے ہٹ کر بغلی کمرے کی طرف ہو گیا۔ اندر قدم رکھا تھا کہ امی اور تائی اماں باتیں کرتے کرتے چونکیں۔

"اے ہیے اس دوپہری میں تو کہاں تھا؟" امی نے فوراً سوال کیا۔

"بھونڑ پہ چلا گیا تھا ذرا۔"

"بھونڑ پہ؟ لونڈے ہوش کی دوا لے۔ قیامت کی لوں چل رہی ہے اور شہزادے جنگلوں میں پھر رہے ہیں۔"

"اے ذرا ڈوبا منہ تو دیکھو لال ہو رہا ہے۔" تائی اماں نے ٹکڑا لگایا۔ "آ بیٹا لیٹ جا، میں پنکھا کروں۔"

اس نے اس پیش کش کو غنیمت جانا اور جوتے اور قمیض اتار آہستہ سے لیٹ گیا۔ تائی اماں نے زور زور سے اسے پنکھا کرنا شروع کر دیا۔ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

دوپہر کو سب بڑے کمرے ہی میں آرام کرتے تھے کہ وہاں بڑا جھالر والا پنکھا لگا ہوا

تھا جسے نوری دوپہر بھر کھینچتی تھی اور خس کی ٹٹیاں دروازوں پر کھڑی تھیں، جن پر تیسرے پہر تک برابر پانی چھڑکا جاتا تھا۔ لیکن امی اب اکثر بچوں کے شور کے بہانے بڑے کمرے سے نکل کر بغلی کمرے میں آجاتیں اور کبھی کبھی تائی اماں بھی وہیں آبیٹھتیں اور سونے کی بجائے دوپہری بھر باتیں ہوتیں، کبھی سرگوشیوں میں کبھی بلند آواز سے۔

"اجی ایک بات ہے۔" تائی اماں کہہ رہی تھیں "لونڈیا ڈوبی اٹھی بھی بہت خراب ہے سارے دن ادائی توائی پھرے ہے، پڑھنا یوں ہووے ہے، پتنا مار کے بیٹھے تو پڑھے آخر آدمی ہے غصہ آہی جاوے ہے ایسے بچے پر۔"

"تائی اماں یہ تم نے کیا بات کہی۔" امی جواباً بولیں "شریر آخر کون سا بچہ نہیں ہوتا؟ تمہارا اچھا کم شریر ہے کیا؟"

"اے وہ سب سے زیادہ شریر ہے۔ اتنا چڑاوے ہے مجھے کہ ڈوبا میرا تو سر ہل جاوے ہے۔"

"تو بس تائی اماں بچے تو شریر ہی ہوا کریں ہیں۔ پر انہیں جان سے نہیں مارا جاتا۔ اجی اس نے تو بہن کو دھنک ڈالا۔ دے پنکھے پہ پنکھا۔ میرا تو کلیجہ ہل گیا۔"

"ہاں ڈوبا ایسا تھا بھی کیا کہ جان کو جان نہ سمجھے،" تائی اماں چپ ہو گئیں۔

امی کی آواز دھیمی پڑ گئی ہوئے سے بولیں "تائی اماں اس لونڈیا میں کچھ سنک ہے۔ کام کرے گی تو کام ہی کرے جائے گی۔ بہن کو پڑھانے بیٹھے گی تو پڑھائے ہی چلی جائے گی جیسے ساتوں علم آج ہی پڑھ کے اُٹھے گی۔"

"خیر یہ تو نسلی اثر ہے۔" تائی اماں بولیں "ہاں کچھ کم ہے بس جو سنک سوار ہو گئی سو سوار ہو گئی اور تیرا میاں؟ ۔۔۔ اب تو ماشاء اللہ بال بچے ہیں، ذمہ داریاں ہیں جب بچہ تھا تب دیکھتیں۔ ایسا ضدی تھا کہ ابا میاں غصہ کرتے مارتے پر کیا مجال کہ وہ اپنی ہٹ سے ٹل جاوے۔"

"ہاں خیر یہ نسلی اثر تو ہے مگر تائی اماں یہ بات تو اور ہے،" امی کی آواز اور دھیمی پڑی اور سرگوشی میں کہنے لگیں "اجی یہ جھموں آپا اسے کب تک بٹھائے رکھیں گی۔ ماشاءاللہ پوری عمر ہے۔ بیاہ شادی کی فکر کرنی چاہیے اب تو اس کی۔"

"ہاں بی بی عمر تو پوری ہے۔ تمہارے ضمیر کی اور اس کی بس تھوڑی چھوٹائی بڑائی ہے۔"

"اجی تائی اماں ضمیر سے تو بہت بڑی ہے تحسینہ"

"نابی بی۔" تائی اماں نے قطعی انداز میں تردید کر دی "جب وہ پیدا ہوئی ہے تو ضمیر پیٹ میں تھا۔ مجھے تو آج کی سی بات یاد ہے کہ جب جھموں چھلا نہائی تھی تو بیبیوں نے کہا تھا کہ لو بی بی نند تو نبٹ گئی اب بھاوج کو ساتھ خیریت کے خدا فارغ کرے۔ اس وقت تجھے ساتواں مہینہ تھا۔"

"خیر لونڈیا کے ساتھ تو ڈھائی تین مہینے کی چھوٹائی بڑائی بھی بہت ہووے ہے۔ لونڈیئیں جلد بڑھیں ہیں۔ اب دیکھتی نہیں ہو ضمیر سے دگنی عمر کی لگے ہے"

"ہاں ماشاءاللہ اٹھان اچھی ہے۔"

"آخر کیا سوچ رہی ہیں بڑی آپا؟"

"کیا خبر ہے کیا سوچ رئی ہے یہ بھی نئیں ہے کہ پیغام نہ ہوں۔ چچا کا لونڈا موجود ہے۔ ایمانداری کی بات ہے کہ باپ کے مرنے کے بعد چچا تایا کہاں پوچھیں ہیں۔ مگر وہ ڈوبا تو بھتیجی کے لئے ترسے ہے۔"

"لونڈا کرے کیا ہے؟" امی نے سوال کیا۔

"وہ کیا پتہ ہے کیا کرے ہے۔ پڑھنا لکھنا جو گا تو وہ ہے نئیں۔ مدارکے مہینے میں بنیاد علی آئے تھے تو میں نے پوچھا کہ اجی بنیاد علی تمہارا امداد انٹر نیس کب کرے گا۔ کہنے لگے کہ تائی اماں، انٹرنیس تو کیا بی اے بھی آج کل جوتیاں چٹخاتے پھریں ہیں۔ ڈگری کو کوئی نہیں پوچھتا۔ میں نے سوچا ہے کہ تمہارے امداد کو پولیس میں بھرتی کرا دوں۔ دو سال میں تھانیداری

کا نمبر آجاوے گا ــــــ ہاں بی بی تھانے دار ہو جاوے تو پھر کیا چاہیئے۔ حاکمی ہے وہ تو مٹی خالی ڈگری کو لے کے کیا کوئی چاٹے؟"

"اجی تائی اماں کیا باتیں کرو ہو، تھانے داریئیں بٹتی تھوڑا ہی پھر رہی ہیں۔ ایف اے بی اے کو تھانے داری ملتی نہیں ہے۔ اُجڈ کو کون تھانے داری دے گا۔"

"بی بی مجھے کیا پتہ ہے تمہاری ڈو بی تھانے داریوں تحصیل داریوں کا۔ بنیاد علی یہی کہو سے تھے۔"

"بنیاد علی چا چاکے کہنے کا کیا ہے وہ تو ایسے ہی شیخیاں بگھارا کرے ہیں۔ مگر خیر ہمیں کیا، امداد تھانے دار ہو جاوے تو ہمیں کیا برا لگے ہے۔ ہمارے تو گھر کی بیٹی جارئی ہے میں تو جانوں کہ بڑی آپا کو اب سوچنا نہیں چاہیئے۔ لونڈا ایسا برا تو ہے نہیں۔ اب تحسینہ کے لئے عرش کا تارا تو اترے گا نہیں۔"

"کیا خبر ہے اس کے دل کی کیا سوچ رہی ہے،" تائی اماں بولیں اور اک ذرا معنی خیز انداز میں "ابا میاں زندہ تھے تو ان کے سامنے بھی کئی دفعہ ذکر آیا تو وہ چپ ہو ہو گئے۔ وہ جنیں کیا سوچتے تھے۔"

کمرے کا دروازہ ہوا کے ایک تند جھونکے کے ساتھ دھاڑ سے کھلا اور ٹھاخ سے بند ہو گیا۔

"آندھی آرئی ہے۔" تائی اماں بے ساختہ بولیں۔

اس نے بھی چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ دالان میں اور آنگن میں زردی کھنڈی تھی۔

"کپڑے اٹھاؤ اپنے اپنے، زور کی اندھیاری ہے۔" بڑی آپا صحن سے چلا رہی تھیں۔ تائی اماں، امی سب کے سب باہر نکل گئے اور الگنی پہ کپڑے اور چارپائیوں پہ بکھرے بستر لپک جھپک اٹھنے لگے۔

"اچھے اوا اچھے اندر آجا۔" تائی اماں اچھے کا ہاتھ پکڑے ہوئے اندر دالان میں آگئیں

پھر پکارنے لگیں "بی بی اندر آجاؤ، کالی آندھی ہے یہ تو"

آندھیوں کا ایک تانتا بندھ گیا تھا۔ ہوا چلتے چلتے بند ہو جاتی، بڑی آپا کے ہاتھ میں سبز اور سرخ لہریوں والا پنکھا تیزی سے گردش کرنے لگتا۔ فاختہ بولتے بولتے نیم کی پھننگ سے بازوؤں کی ایک میٹھی پھڑپھڑاہٹ کے ساتھ اٹھتی چرخ کھاتی اور فضا میں تیرتی تیرتی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی۔ "کواد کواد" کی نشیلی شیریں آواز کہ جانے کون سے آم کے پیڑ کی کون سی گھنی ٹہنی سے پروا کا جھونکا بن کر اٹھتی اور گرم تپتی فضا میں ٹھنڈک کی اک لکیر کھینچتی چلی جاتی۔ ٹھنڈک کی لکیر کھنچتی چلی جاتی، گہری ہوتی چلی جاتی، پھر اک دم سے کوئل کی آواز بند، ٹھنڈک کی لکیر غائب۔ تائی اماں پنکھا بڑی آپا کے ہاتھ سے لے لیتیں "بی بی بڑی گرمی ہے۔ ہوا بند ہو گئی۔" اور بڑی آپا یکایک اس سے مخاطب ہوتیں "ضمیر تم یہاں کیوں بیٹھے ہو؟ اندر پنکھے میں جا کے لیٹ جاؤ۔ ہر وقت پڑھنا ڈوبا پڑھنا نہ ہوا وبال جان ہو گیا۔" اور اتنے میں تائی اماں کا پنکھا جھلتا ہوا ہاتھ ڈھیلا پڑ جاتا اور آنکھیں آسمان کو تکنے لگتیں، کھوئی کھوئی آوازیں، جس میں امید کے ساتھ ساتھ اندیشے کی بھی ایک خفیف سی کیفیت ہوتی کہتیں "آندھی آ رہی ہے"، ساری کی ساری نظریں ایک دم سے اوپر اٹھ جاتیں، جہاں آسمان میلا میلا نظر آتا اور اس کے سائے میں بہت سی چیلیں آہستہ آہستہ دائرے سے بناتی ہوئیں، نشے میں نڈھال ناچتیں غش کھاتیں پھر اچانک سے نیم کی ٹہنیوں میں ایک ہیجانی لرزش ہوتی اور کسی گھنی ٹہنی میں کوئی چھپا کوا چونک کر "قاں" کرتا اور پیتوں کے ہرے پودوں سے نکل کر باہر آتا اور چیختا چیختا کووں کے شور مچاتے بھاگتے دوڑتے سراسیمہ غول میں جا شامل ہوتا۔ چڑیوں اور کووں کی سراسیمگی نیچے اترتی اور مرغیوں کو چونکاتی کہ ان کی گردنیں ایک دم سے "قاں" کی دھیمی سی آواز کے ساتھ کھڑی ہو جاتیں اور کان کچھ سننے کی کوشش کرتے۔ پھر یہ گھبراہٹ انسانوں پر اپنا اثر دکھاتی۔ دوسری تیسری منزل پر کسی کھلے دریچے کے کنواڑ ایک اچانک شور کے ساتھ بند ہو کر کھلتے اور پھر بند ہو جاتے "میاں آندھی آ رہی ہے" اور

یہ آواز کوٹھوں کوٹھوں بلند ہوتی چلی جاتی۔ قریب و دور پھیلی ہوئی کچی پکی چھتوں سے چارپائیوں کے بستر اور تاروں پہ پڑی ہوئی سفید سفید چادریں اور نیلی نیلی ساڑھیاں اور دھوپ میں سوکھتے ادھ گیلے نیلے گلابی فیروزی دوپٹے گرد میں اٹنے لگتے اڑنے لگتے، بڑی بوڑھیاں لڑکیاں بالیاں لپک جھپک دوپٹے اور ساڑھیاں تاروں سے اتار بستر سروں پر رکھ منڈیروں پھلانگتیں سیڑھیاں اترتی نیچے آنے لگتیں اور کمروں کے دروازے اندر سے بند ہونے لگتے کہ اتنے میں دیکھتے دیکھتے ساری فضا میں زردی کھنڈ جاتی اور مٹیالے جھکڑ چلنے لگتے۔

آندھی کا کوئی وقت مقرر نہ تھا، کبھی عین دوپہر میں آسمان پیلا پڑنے لگتا، کبھی سہ پہر کو تو کبھی شام کو، اور پھر سہ پہر کا وقت مقرر سا ہو جاتا کہ بندھے ہوئے وقت پہ آسمان میں زردی کا ایک ہالہ نمودار ہوتا اور اس کے سائے میں نشے سے نڈھال ناچتی اونگھتی چیلوں کے حلقے، مگر کسی دن باری ٹوٹتی اور رات کو سوتے سوتے فضا میں کہیں دور ایک اندھیری آلیتی اور آنگنوں اور چھتوں اور کوٹھوں پہ نیند کا باندھا ہوا طلسم تیزی سے ٹوٹتا جاتا نہ کوئی رنگ مقرر تھا کہ عام طور پر تو پیلی ہی ہوتی، لیکن کسی کسی دن ایکا ایکی پلاپی میں کالونس پیدا ہوتی چلی جاتی، اور تیسرا پہر ہوتے ہوتے اتنا اندھیرا چھا جاتا کہ دوکانوں اور مکانوں میں لالٹینیں جل جاتیں۔

آندھی سہ پہر کو آتی، شاموں کو آتی، آدھی آدھی راتوں کو اٹھتی، مگر اس کا ثمر ہمیشہ صبح کو ظاہر ہوتا کہ گلیوں میں کنجڑے جھڑی ہوئی امیوں کے ٹوکرے سے ٹوکرے لے کر آتے اور آنوں کا مال ٹکوں میں بیچ کر جاتے۔ کل کی کالی آندھی نے امیاں ہی نہیں امیوں کے لدے پھندے تناور درخت گرائے تھے۔ حویلی میں چارپائی پہ امیوں کا ڈھیر لگا تھا اور تائی اماں اور بڑی آپا کے ہاتھوں میں چاقو درد دے رہے تھے۔

"سُنیں ہیں کہ ایک پتھر تین من کا شیخوں کی ٹال میں پڑا تھا وہ اُڑ گیا، اور اڑ کے ایک دھلینور کے چھپر پہ جا پڑا۔ ڈوبے کا چھپر گر پڑا۔"

بڑی آپا حیران ہونے لگیں "تائی اماں مجھے تو یقین نہیں آتا" پھر ضمیر سے مخاطب

ہوئیں کہ اس کی سائنس دانی پر ان کو پورا اعتبار تھا اور جب کوئی بات انہیں خلاف عقل معلوم ہوتی تو اس سے رجوع کرتی تھیں "ضمیر میاں، تم نے تو سائنس پڑھی ہے تم بتاؤ تین من کا پتھر کہیں اڑ سکے ہے۔"

تائی اماں نے ضمیر کو بولنے کی مہلت نہیں دی "ہم تمہاری ڈوبی اینس سنیں، کو تو جانتے نئیں ہیں، ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ بڑھیا کنجڑی امیں لے کے کل تو آوے گی، ہی پوچھ لیجو، اسے ہاں ڈوبی کی نند کا لونڈا آندھی میں اڑ گیا۔ اب تک تو ملا نئیں ہے۔"

بڑی آپا نے پھر تامل کیا "عقل میں آنے والی بات نہیں ہے کہ اتنا بڑا لونڈا اور آندھی میں اڑ جاوے۔"

"بی بی عقل میں کون سی بات آوے ہے" تائی اماں کہنے لگیں "یہ تو حیرت کا کارخانہ ہے میری تو کالی آندھی کو سوچ سوچ کے ہی عقل حیران ہووے ہے۔ بس اس کے بھید وہی جانے۔"

"تائی اماں" بنی بولی "آپ کہہ رہی تھیں کہ کالی آندھی میں پریمیں ہوویں ہیں۔"

"بیٹی میں تو یہ کہہ رہی تھی، ہم نے تو ایسا ہی سنا ہے، آگے جن پیچھے جن، تخت پہ راجہ اندرا اور ارد گرد پریوں کا حلقہ۔"

"تائی اماں" بنی سوچتے ہوئے بولی "میں بتاؤں لونڈے کو کون لے گیا۔ اسے پریئیں اڑا کے لے گئیں۔"

بڑی آپا گرم ہو گئیں "اسے دیکھو کیسی باتوں کے ٹکے ڈھالے ہے۔ سبق تو نے لیا آج؟ ارے تحسینہ تو نے سبق دیا ہے اسے؟"

بنی کو جانے سانپ سونگھ گیا۔

"بنی ادھر آؤ، سناؤ سبق" تحسینہ کی تحکمانہ آواز باورچی خانے سے آئی۔

تائی اماں کی باتوں کا تار ٹوٹ گیا تھا اور چاقو ہاتھ میں تیزی سے چلنے لگا تھا۔ اب تو امیا میں گٹھلی پڑ گئی ہے۔ آم اب آتا ہی ہوگا۔"